© rasailojaraid.com

مشفق خواجہ اردو زبان وادب کی آبرو

ابن الحسن عباسی

اردو زبان وادب کے یگانہ روزگار محقق ونقاد حضرت مشفق خواجہ بھی مسافرانِ آخرت میں شامل ہوگئے، وہ ۱۹۳۶ء کو لاہور میں پیدا ہوئے تھے اور وفات کے وقت ان کی عمر ۶۹ سال تھی، خواجہ صاحب کا اصل نام عبدالحی تھا، مشفق خواجہ ان کا قلمی نام تھا، لیکن ابتدا میں یہ نام بھی ہمارے لیے اجنبی تھا، البتہ ان کا ایک اور قلمی یا کالمی نام ''خامہ بگوش'' سے اسی وقت سے واقفیت تھی جب ایک معاصر ہفت روزے میں ''سخن درسخن'' کے عنوان سے وہ مزاحیہ ادبی کالم لکھا کرتے تھے، یہ کالم اپنے زمانے میں اردو کا مقبول ترین کالم تھا اور اردو دنیا کے کئی اخبارات ورسائل میں شائع ہوا کرتا تھا جس پرچے میں ان کا کالم شائع ہوتا، اس پرچے کی اشاعت، دو تین گنا بڑھ جاتی، ہماری طرح کئی قارئین، اس کالم کو دیکھ کر ہی رسالہ خریدتے تھے، اس میں وہ کسی بڑے ادیب یا اس کی کتاب وتحریر کو لے کر اس پر تبصرہ کرتے اور خوبیوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اس میں چھپی ہوئی زبان وبیان کی خامیوں کو یوں اُجاگر کرتے کہ نکتہ آفرینی پر انھیں بے اختیار داد دینے کو جی چاہتا، ان کا یہ کالم، پڑھنے والوں کے ہونٹوں پر صرف مسکراہٹیں ہی نہیں بکھیرتا، بلکہ انھیں کئی کتابوں کے تعارف کے ساتھ مذاق تحقیق سے بھی آشنائی بخشتا۔ ان کے ان کالموں کی تعداد ایک ہزار سے زیادہ ہے اور اب تک ان کے تین مجموعے ''خامہ بگوش کے قلم سے''، ''سخن درسخن'' اور ''سخن ہائے گفتنی'' کے عنوان سے شائع ہو چکے ہیں۔

آج سے تقریباً چار پانچ سال پہلے ظفر جنجوعہ صاحب سے ملاقات ہوئی، میری کتاب ''متاعِ وقت'' پڑھ کر وہ مجھ سے ملنے آئے، وہ ہوتے تو کسٹم میں ہیں لیکن انھیں اللہ جل شانہ نے جو ذوقِ مطالعہ عطا فرمایا ہے، وہ بہت کم لوگوں کو نصیب ہوتا ہے، انھیں کتاب اور مطالعہ سے جنون کی حد تک عشق ہے اور احباب کا بڑا وسیع اور متنوع حلقہ رکھتے ہیں۔ ان سے ملاقاتیں بڑھیں تو مشفق خواجہ صاحب کا ذکر آیا اور ایک دن وہ آکر مجھے خواجہ صاحب کی مجلس میں لے گئے، معلوم ہوا کہ جنجوعہ صاحب اور خواجہ صاحب کے ایک دوسرے کے ساتھ گھریلو مراسم بھی ہیں، جنجوعہ صاحب ان کے والد خواجہ عبدالوحید صاحب سے خصوصی تعلق رکھتے تھے، انھوں نے تعارف کروایا اور یوں مجھے مشفق خواجہ کی مجلسوں میں کبھی کبھار جانے اور ان سے استفادہ کا موقع ملا۔

خواجہ صاحب کی یہ مجلس صرف اتوار کے دن تقریباً دس بجے سے ڈھائی تین بجے تک جاری رہتی تھی، اس میں ادیب، کالم نگار، پروفیسر، اساتذہ اور تحقیقی کام کرنے والے سب ہی طرح کے لوگ آتے، خواجہ صاحب اس مجلس کے گل

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

سر سبد ہوتے، چائے کا دور چلتا، لوگ آتے اور جاتے رہتے، خواجہ صاحب بڑے وضع دار انسان تھے، رکھ رکھاؤ اور قدر و منزلت کا بڑا خیال رکھتے، یہ بڑی علمی اور مفید مجلس ہوتی تھی اور عموماً ''کتاب'' ہی مجلس کا موضوع ہوتی، سیاسی اور عالمی حالات پر بھی تبصرہ ہوتا، ادیبوں اور ادبی تنظیموں کی تقریبات اور آپس کی چشمکوں کا بھی ذکر ہوتا، نئی کتابوں کا تذکرہ بھی چلتا، ان کے پاس دنیا بھر سے روزانہ دسیوں کتابیں آتیں، ان کی خوبیوں اور خامیوں کا بھی بیان ہوتا، خواجہ صاحب ادبی تقریبات اور نمود و نمائش سے دور رہنے والے آدمی تھے۔ خود اُن کا شعر ہے:

کمالِ بے ہنری بھی ہنر سے کم تو نہیں　　　مرا شمار کہیں ہو مجھے یہ غم تو نہیں

لیکن ہندو پاک کے ادبی حلقوں پر ان کی پوری نگاہ ہوتی تھی اور گوشہ مطالعہ میں رہ کر بھی وہ ان کے اندر کی باتوں تک کا علم رکھتے تھے، ان کا حافظہ غضب کا تھا، کس موضوع پر، کون سے مصنف نے کیا لکھا ہے اور کیسا لکھا ہے، یہ سب انھیں محفوظ ہوتا، ان کا لطیف حسِ مزاح وقفہ وقفہ سے مجلس کو کشت زعفران بنائے رکھتا، وہ جتنی خوب صورت اردو لکھتے تھے، اتنی ہی خوب صورت اور شگفتہ اردو بولتے بھی تھے۔

خواجہ صاحب کو اللہ تعالیٰ نے تحقیقی ذوق عطا فرمایا تھا اور اکثر زندگی انھوں نے کتاب اور مطالعہ کی آغوش میں گذاری، انھوں نے ''جائزہ مخطوطات اردو'' کے نام سے ساڑھے بارہ سو صفحات پر مشتمل ایک کتاب لکھی جس میں اردو زبان کے مخطوطات اور ان کے مؤلفین کا بڑی دقت رسانی کے ساتھ تعارف کرایا گیا ہے، کون سا مخطوطہ کس لائبریری میں کیسی حالت میں ہے؟ اسے سوچ کر ہی دانتوں کو پسینہ آجاتا ہے، ان کی یہ کتاب مرکزی اردو بورڈ نے شائع کی ہے...... سعادت علی خان ناصر نے اردو زبان کے شعراء کا تذکرہ ''خوش معرکہ زیبا'' کے نام سے کیا ہے، اس پر بھی انھوں نے ترتیب و تحقیق کا علمی کام کیا اور ۱۹۷۰ء میں مجلس ترقی ادب نے اسے دو ضخیم جلدوں میں چھاپا...... غالب کے خطوط اردو زبان و ادب میں بڑی انفرادیت رکھتے ہیں، غالب کے مکتوب الیہ صفیر بلگرامی تھے ''غالب اور صفیر بلگرامی'' کے نام سے انھوں نے کتاب لکھی جس میں صفیر بلگرامی اور متعلقہ موضوع کا تحقیقی تعارف کرایا ہے، یہ کتاب ۱۹۸۱ء میں چھپی ہے...... ۱۹۸۰ء میں انھوں نے ''تخلیقِ ادب'' کے عنوان سے ایک کتابی سلسلہ شروع کیا جو بہت مقبول ہوا۔ ۱۹۸۵ء تک پانچ پرچے نکالنے کے بعد اسے بند کردیا، اس سلسلہ کا کوئی بھی پرچہ پانچ سو صفحات سے کم نہیں، بلکہ تیسرا پرچہ آٹھ سو چالیس صفحات کا ہے، ان سے اس کے بند کرنے کی وجہ پوچھی گئی تو کہنے لگے ''چونکہ اس سے حلقہ احباب بہت وسیع ہو رہا تھا جس کی بناء پر دوسرے کاموں کا حرج ہو رہا تھا، اس لیے اسے بند کردیا''...... ۲۰۰۳ء میں یاس یگانہ چنگیزی کی کلیات پر ان کا تحقیقی کام اکادمی بازیافت نے شائع کیا ہے، یہ کتاب نو سو ساٹھ صفحات پر مشتمل ہے اور خواجہ صاحب نے تقریباً عمر عزیز کے پندرہ سال اس میں صرف کیے، اسے اردو زبان و ادب میں تحقیق کی آبرو کہنا بے جا نہ ہوگا، تدوینِ متن اور تحقیق و حواشی کی یہ ایک لازوال مثال ہے اور اس میدان میں ان کے ساتھ ہندوستان کے رشید حسن خان کو چھوڑ کر کسی اور کا نام نہیں لیا جاسکتا۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

مشفق خواجہ صاحب دل کے دین دار اور مشرقی تہذیب کے علمبردار تھے، وہ نوے فیصد ادیبوں کے برعکس علماء، دینی مدارس اور دین داروں سے محبت کرنے والے شخص تھے، ان کے والد خواجہ عبدالوحید مرحوم امام الاولیاء حضرت مولانا احمد علی لاہوری رحمہ اللہ کے مرید خاص تھے اور ان کے انگریزی رسالے کے ایڈیٹر بھی تھے، بچپن میں ان کے گھر علماء اور صلحاء کا آنا جانا رہتا، ایسے گھرانوں میں تربیت پانے والوں پر بہرحال دین وایمان کا اثر ہوتا ہے اور خواجہ صاحب میں یہ اثر بہت نمایاں طور پر محسوس کیا جاسکتا تھا، ان کے والد مرحوم نے ۱۹۲۸ء سے ۱۹۳۸ء تک دس سالوں کی ڈائری لکھی تھی، خواجہ صاحب آج کل اسی پر کام کر رہے تھے۔ اس ڈائری میں کئی علماء اور ممتاز شخصیات کا بھی تذکرہ ہے، وہ اس ڈائری کا اپنے تحقیقی حواشی میں ان علماء کا تعارف بھی لکھ رہے تھے اور کوئی ڈیڑھ سو کے قریب اہل علم پر وہ لکھ چکے تھے۔ اس سلسلے میں وہ رجال کی اردو، فارسی اور انگریزی کتابوں کو بھی جمع کر رہے تھے اور ضرورت محسوس کر رہے تھے کہ سرحد اور خاص کر ہزارہ کے علماء کی سوانح وتعارف پر کام کیا جائے، مجھ سے ایک بار کہنے لگے کہ ”آپ کے پاس افراد ہیں، اس لیے یہ کام شروع کر دیں، مجھ سے جو تعاون ہوسکے گا میں وہ کروں گا۔“ بہرحال ان کے آخری ماہ وایام ان ہی گم گشتہ علماء واولیاء کے تذکرے پڑھنے اور لکھنے میں گزرے جسے ان کے تحقیقی کاموں کا حسن خاتمہ کہا جاسکتا ہے، وہ آخر میں زیادہ تر وقت اسی کام کو دے رہے تھے، گذشتہ سال جب دل کا دورہ پڑنے کے بعد وہ صحت یاب ہوئے تو میرے پوچھنے پر بتلانے لگے کہ آج کل میں کرسی پر بیٹھ کر چودہ گھنٹے کام کرتا ہوں، شاید وہ سمجھ گئے تھے کہ:

نسیم جاگو، کمر کو باندھو اٹھالو بستر کہ وقت کم ہے

ویسے زمانہ صحت میں ان کا معمول اٹھارہ اٹھارہ گھنٹے بیٹھ کر کام کرنے کا تھا۔ آخر میں خواجہ صاحب کی ایک غزل کے چند اشعار:

دہر کو لمحۂ موجود سے ہٹ کر دیکھیں — نئی صبحیں نئی شامیں نئے منظر دیکھیں
گھر کی دیواروں پہ تنہائی نے لکھے ہیں جو غم — مرے غم خوار! انھیں بھی کبھی پڑھ کر دیکھیں
آپ ہی آپ یہ سوچ کوئی آیا ہوگا — اور پھر آپ ہی دروازہ پہ جا کر دیکھیں
کچھ عجب رنگ سے کٹتے ہیں شب وروز اپنے — لوگ کیا کچھ نہیں کہیں ہم کو جو آ کر دیکھیں

☆☆☆

مال حرام کے نقصانات

☆—دعائیں رد کردی جاتی ہیں۔ ☆— نفس کی کمینگی اور خساست کی دلیل ہے۔ ☆—اللہ کی ناراضگی اور جہنم تک پہنچانے والا راستہ ہے۔ ☆—ایسے شخص سے اللہ بھی نفرت کرتا ہے اور اللہ کے بندے بھی۔ ☆—نیک اعمال اور اقوال واذکار کا ثواب ضائع ہوجاتا ہے۔ ☆—ضعفِ ایمان اور اللہ پر یقین نہ ہونے کی علامت ہے۔

﴿نضرة النعيم﴾

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

دور جدید کا فکری چیلنج اور دینی مدارس

پروفیسر ڈاکٹر حافظ شبیر احمد جامعی

دینی مدارس: ان مدارس کا وجود ہی اسلامی تعلیمات کی بقا کا ضامن ہے اور یہ محض کوئی مشغلہ یا دھندہ نہیں جسے بعض لوگ اپنائے ہوئے ہیں بلکہ یہ سرور دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت اور طریق عمل کی صدائے بازگشت ہے۔ اس لیے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے منصب نبوت کے فرائض میں دین کی تعلیم کو بنیادی حیثیت سے پیش کیا گیا ہے۔ چنانچہ قرآن کریم میں متعدد جگہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے منصب رسالت کے ذیل میں یہ تذکرہ موجود ہے کہ "هو الذي بعث في الأميين رسولا منهم يتلوا عليهم آياته ويزكيهم ويعلمهم الكتاب والحكمة "تعلیم کتاب وحکمت سے قرآن وسنت کی تعلیم ہی مراد ہے اور اسی امر کی تکمیل کے لیے خود معلّم انسانیت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے عہد میں باقاعدہ ایک ادارہ "صفہ" مسجد نبوی میں قائم کیا، جس میں سینکڑوں طلبہ، علوم دینیہ کی تحصیل کے لیے اقامت پذیر ہوتے اور انھیں معلّم اوّل سید کائنات خود تعلیم سے آراستہ کرتے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے خود اپنی معلمانہ حیثیت اور منصب کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا: "انما بعثت معلما" کہ بے شک مجھے اللہ تعالیٰ نے معلّم بنا کر مبعوث کیا ہے۔

مدینہ طیبہ کے علاوہ گردوپیش کے قبائل کی تعلیم وتعلم کے لیے آپ صلی اللہ علیہ وسلم باضابطہ معلمین مقرر کرتے جو انہیں دینی علوم وفرائض سے آگاہ کرتے۔ آنجناب علیہ الصلاۃ والسلام کے بعد خلافت راشدہ کے عہد میں تعلیم وتعلم کا یہ سلسلہ پوری اسلامی ریاست میں پھیلا دیا گیا جس کے بڑے مراکز مدینہ طیبہ کے علاوہ مکہ معظمہ، کوفہ، بصرہ، بغداد اور دیگر شہروں میں تھے۔ جہاں جلیل القدر صحابہ کرامؓ مسلمانوں کو اسلامی تعلیمات سے آگاہی مہیا کرتے اور پہلی صدی کے آخر تک ایسے سینکڑوں مراکز معرض وجود میں آچکے تھے جہاں علوم اسلامیہ کی تحصیل کے لیے دور دراز کا سفر کر کے طالبان علوم دینیہ کشاں کشاں آتے اور قرآن وسنت کے انوار سے معمور قلب ونظر کے ساتھ اپنے اپنے علاقوں میں واپس جا کر اس روشنی سے اندھیروں کو اجالوں سے بدل دیتے اور یہ فریضہ امت مسلمہ نے اس تسلسل اور محنت کے ساتھ ادا کیا کہ جس کی کوئی نظیر علم کی دنیا میں نہیں ملتی اور یہ فرض امت مسلمہ پر خود رب العالمین نے عائد کیا تھا، جیسا کہ ارشاد ربانی ہے:

"فلولا نفر من كل فرقة منهم طائفة ليتفقهوا في الدين و لينذروا قومهم إذا رجعوا إليهم لعلهم يحذرون" (التوبۃ ۹:۱۲۲) "ایسا کیوں نہ ہوا کہ آبادی کے ہر حصے میں سے کچھ لوگ نکل کر آتے اور دین کی سمجھ پیدا کرتے اور واپس

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

جا کر اپنے علاقے کے باشندوں کو خبردار کرتے تا کہ وہ بھی محتاط (اسلامی روایات پر مبنی) زندگی بسر کرتے۔"

اس آیت کریمہ میں مسلمانوں کو واضح طور پر حکم دیئے گئے ہیں۔ ایک یہ کہ وہ ایسے ادارے قائم کریں جہاں علوم دینیہ کی تعلیم اور دین کا شعور دیا جاتا ہو۔ اور دوسرا یہ کہ ایسے علاقوں کے لوگ جہاں دینی تعلیم کا بندوبست نہیں، وہاں سے کچھ افراد کو لازماً علوم دینیہ کی تحصیل کے لیے بھیجیں تا کہ وہ قرآن وسنت کا شعور حاصل کرنے کے بعد واپس پلٹ کر اپنی قوم کو اسلامی احکامات سے آگاہ کریں۔ خود جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے جس علم کو فرض قرار دیا ہے وہ بھی اساسی طور پر علم دین ہی ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: طلب العلم فريضة على كل مسلم، وفي رواية ومسلمة۔

قرآن وسنت کے ان واضح احکام اور امت مسلمہ کے تسلسل اور تعامل سے یہ نتیجہ اخذ کرنا کوئی مشکل کام نہیں کہ دینی مدارس کا وجود اسلام کی بقاء اور احیاء کا تقاضا ہے۔ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کا حکم اور امت مسلمہ کی شاندار اور تابندہ روایت ہی اسلامی تہذیب وثقافت کی علامت ہے۔

مگر ہمارے مغربی تہذیب کے دل دادہ حکمران اور ان کے ناکندہ تراش مرعوب ذہن اس حقیقت کو جانتے ہوئے ان مدارس اسلامیہ کا وجود مٹانے کے درپے ہیں اور اس کے لیے وہ ہر طرح کے حربے اور ہر نوع کے ہتھکنڈے استعمال کر رہے ہیں۔ اس لیے کہ دینی اداروں سے فراغت حاصل کرنے والے علماء اپنی کمزوریوں اور کوتاہیوں کے باوجود اپنی تہذیب کی نمائندگی کرتے ہیں، یہ امت اسلامیہ میں مغربی اثر ونفوذ اور اباحیت پسندی کی راہ میں حائل ہیں۔ وہ دنیا میں مظلوم اور انسانی حقوق سے محروم قوموں کے حامی ومددگار اور ان تمام جہادی قوتوں کے ممد ومعاون ہیں جو دنیا میں حق طلبی، حق پرستی اور اپنے دینی اور ایمانی تشخص کی جدوجہد میں مصروف ہیں۔

دو صدیوں کی طویل محنت اور جدوجہد اور جہاد کے نتیجے میں دینی مدارس نے ملک کے علمی اداروں میں نمایاں اور مؤثر مقام حاصل کر لیا ہے۔ انگریزی دور استبداد میں علماء نے خشک روٹیاں کھا کر اور پیٹ پر پتھر باندھ کر تعلیم وتعلم اور درس وتدریس کا سلسلہ جاری رکھا۔ فقر وفاقہ اور کسمپرسی کے عالم میں تشنگان علوم دینیہ نے اس شان سے علم حاصل کیا کہ آسمان علم پر سورج اور چاند بن کر چمکے۔ مولانا محمد قاسم نانوتوی، مولانا احمد علی سہارنپوری، مولانا عبدالحیٔ لکھنوی، مولانا عبدالحق خیرآبادی، شیخ الہند مولانا محمود الحسن، حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی، اعلیٰ حضرت مولانا شاہ احمد رضا خان بریلوی، مفتی نذیر حسین دہلوی، علامہ انور شاہ کشمیری، علامہ شبیر احمد عثمانی، مولانا ظفر احمد عثمانی، مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی، مفتی اعظم پاکستان مولانا محمد شفیع دیوبندی، علامہ ابوالحسنات قادری، مولانا داود غزنوی، مولانا ابوالحسن علی ندوی، مولانا گوہر رحمٰن، مولانا امین احسن اصلاحی اور اسی سلسلۂ کہکشاں کے ہزاروں ستارے آسمان پر جگمگ جگمگ کرتے نظر آتے ہیں۔ یہ انہی جلیل القدر اور عظیم المرتبت علماء کا فیض ہے کہ سرزمین پاکستان، جس میں انگلیوں پر گنے جانے والے چند مدارس تھے جو مساجد سے ملحق عمارات میں ہوتے تھے۔ آج ملک کا چپہ چپہ ان مدارس کے نور سے منور ہے اور ایک ایک مدرسہ ایک ایک یونیورسٹی کا منظر پیش کر رہا ہے۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

انگریزی اخبارات میں مدارس کے خلاف مہم: انگریزی اخبارات میں کالم نویسوں کی ایک بڑی تعداد دینی مدارس، اسلامی تحریک اور اسلامی اقدار وروایات اور شعائر اسلام کے خلاف سرگرم عمل رہتے ہیں۔ ان میں سے چند کے نام درج ذیل ہیں: ا۔ مفتاح اسماعیل: روزنامہ ڈان ۲۔ امینہ جیلانی۔ روزنامہ ڈان، ۳۔ اکرام الحق، روزنامہ دی نیشن ۴۔ اسماعیل خان، روزنامہ دی نیوز، ۵۔ اقبال احمد، روزنامہ ڈان، ۶۔ پروفیسر رفیع اللہ شہاب، روزنامہ دی نیشن، ۷۔ عامر میر، دی فرائیڈے ٹائمز، ۸۔ ڈاکٹر یاسمین کیانی، روزنامہ ڈان، ۹۔ عذرا سید، روزنامہ دی نیوز، ۱۰۔ ڈاکٹر ثمن یزدانی، دی فرائیڈے ٹائمز، ۱۱۔ سبا سرور، روزنامہ دی نیوز، ۱۲۔ رفیع صفدر، روزنامہ دی نیوز، ۱۳۔ عبدالجلیل ملک، روزنامہ دی نیشن۔

امریکہ اور حکومت پاکستان کے عزائم: ماہنامہ ساحل کراچی، امریکی سینٹروں اور کارل انڈرفرتھ کی سرگرمیوں کو بیان کرتے ہوئے لکھتا ہے:

"پاکستان پر گذشتہ پچاس برس سے مغربی استعمار کے گماشتوں کی حکمرانی ہے۔ طاقت واختیار کے مراکز پر مغرب کی تیار شدہ اقلیت کی حکمرانی ہے، مگر اس حکمرانی کا دائرہ آج تک عوام کے قلب وذہن تک وسیع نہیں ہوسکا۔ اس کی وسعت کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ یہ چھوٹے چھوٹے مدرسے اور چھوٹی چھوٹی مساجد ہیں جہاں سے پانچوں وقت اذان کی آواز بلند ہوتی ہے اور کسی بستی میں یہ حادثہ رونما نہیں کہ مسجد میں اذان کی آواز بلند نہ ہوئی ہو، کبھی جماعت سے نماز ملتوی ہوگئی ہو اور کبھی تعطیل کے باعث مسجد ومدرسہ پر تالا پڑ گیا ہو۔ آندھی بارش، طوفان، ہنگامے، زلزلے، سیلاب اور جنگوں کے زمانوں میں بھی ان مساجد سے اللہ کا نام بلند ہوتا رہا ہے اور ان مساجد ومدارس کے بوریا نشین علماء کے سامنے، ریاست کی قوت کو بھی کبھی نہ کبھی سجدہ کے لیے حاضر ہونا پڑتا ہے۔

اسلام آباد پر ان دنوں امریکہ کے وفود کی یلغار ہوگئی ہے۔ حکمران ڈیموکریٹک پارٹی کے چار سینٹر کا وفد ٹام ڈیشل کی سربراہی میں، اس کے بعد ری پبلک پارٹی کے سینٹر ٹام براؤن میک کا وفد، پھر برطانیہ کے چیف آف ڈیفنس اسٹاف جنرل چارلس لوتھرائی کی آمد اور اب دفتر خارجہ کے رابطہ کار برائے انسداد دہشت گردی مائیکل شیہان کی آمد، مساجد ومدارس کے حوالے سے نہایت اہم ہے۔ آنے والے تمام وفود خواہ وہ سرکاری ہوں یا غیر سرکاری، پاکستان دوست تھے یا دشمن، کلنٹن انتظامیہ (اب بش انتظامیہ) کے حامی تھے یا مخالف، جنرل پرویز مشرف حکومت سے ان کا پہلا مطالبہ یہ تھا کہ مدارس کو پابند کیا جائے اور ان مدارس سے اٹھنے والی جہادی تحریکوں اور قوتوں پر مکمل پابندی عائد کی جائے۔ صرف یہی نہیں امریکی سینٹروں اور اب نائب وزیر خارجہ انڈرفرتھ نے صاف صاف لفظوں میں حرکۃ الانصار، حزب المجاہدین نامی تنظیموں پر مکمل پابندی عائد کرنے کا مطالبہ بھی کیا ہے۔ پاکستان کو اپنی حدود میں سرگرم مسلح اسلامی گرہوں کو کچلنا ہوگا جو بین الاقوامی

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

برادری کے لیے ایک بڑا خطرہ بن چکے ہیں۔ ہمیں امید ہے کہ پاکستان ایسے انتہا پسند گروہوں کے خلاف کارروائی کرے گا جو تشدد کے واقعات میں ملوث ہیں۔ اس موقع پر انھوں نے حرکۃ الانصار اور حرکۃ المجاہدین جیسی تنظیموں کو انتہا پسند کہہ کر ان پر پابندی کا مطالبہ کیا (جو مشرف حکومت نے پورا کر دیا)۔ (ماہنامہ ''ساحل'' ص ۱۷، فروری ۲۰۰۰ء)

لیفٹننٹ جنرل ضیاء الدین جو کہ آئی ایس آئی کے سابق سربراہ ہیں، امریکہ کی سی آئی اے کی دعوت پر امریکہ کے دورہ پر گئے۔ انھوں نے امریکی قانون سازوں سے پاکستان کی بنیاد پرست اسلامی عناصر کو کنٹرول کرنے کے لیے مدد طلب کی۔ (روزنامہ ''ڈان'' ۲۶ ستمبر ۱۹۹۹ء) مغربی اسکالروں کی جانب داری ملاحظہ فرمائیں۔ لارڈ ویلیز ایس میگ لکھتے ہیں: ''یہ دنیا تشدد سے بھرپور ہے، مشرقی تیمور میں قتل عام، روس میں بم دھماکے میں ۳۰۰ روسیوں کی چیچنیا کے دہشت گردوں کے ہاتھوں ہلاکت، کوسوو میں پہلے البانوی، بعد میں بعد میں سرب باشندوں کا صفایا، کشمیر میں بنیاد پرست مسلم پاکستان اور بنیاد پرست ہندوستان کا مقابلہ وغیرہ وغیرہ۔ (روزنامہ ''ڈان'' ۲۶ ستمبر ۱۹۹۹ء)

پاک و ہند کے مدارس کا امتیاز آزادی ہے۔ انھوں نے غلامی کو کبھی قبول نہیں کیا۔ انھیں مدارس کی بدولت آج دین اور دینی تہذیب زندہ ہے۔ ان کا وجود مٹا کر یہ توقع عبث ہوگی کہ پھر اسلام اور اسلامی تہذیب کا وجود برقرار رہ سکے گا اور جو قوم اپنے ماضی کی درخشاں روایات کو نظر انداز کرنے کی خوگر بن جائے وہ اپنا ملّی تشخص اور قومی وقار بھی برقرار نہیں رکھ سکتی، اور ایک دریوزہ گر اور لاوارث قوم بن کر رہ جاتی ہے۔ بتدریج جس کی شناخت بھی تحلیل ہو کر رہ جاتی ہے۔

علامہ اقبال مرحوم نے حکیم احمد شجاع صاحب مرحوم سابق سکریٹری پنجاب لیجسلیٹو اسمبلی سے بچشم تر فرمایا تھا:

''ان (دینی) مکتبوں کو اسی حالت میں رہنے دو۔ غریب مسلمانوں کے بچوں کو اپنے مکتبوں میں پڑھنے دو۔ اگر یہ ملّا اور یہ درویش نہ رہے، تو جانتے ہو کیا ہوگا؟ میں اسے اپنی آنکھوں سے دیکھ آیا ہوں۔ اگر مسلمان ان مکتبوں کے اثر سے محروم ہو گئے تو بالکل اسی طرح جس طرح ہسپانیہ میں مسلمانوں کی آٹھ سو برس کی حکومت کے باوجود آج غرناطہ اور قرطبہ کے کھنڈر اور الحمراء اور الاخوتین کے سوا۔ اسلام کے پیروؤں اور اسلامی تہذیب کے آثار کا کوئی نقش نہیں ملتا۔ اسی طرح یہاں بھی اسلامی تہذیب کا کوئی نشان نہیں ملے گا''۔

ہم سمجھتے ہیں کہ دینی مدارس کے خلاف یہ دانستہ یا نادانستہ چلائی جانے والی مہم ایک بین الاقوامی کفر کی اس سازش کا نتیجہ ہے جو اسلام کے ان قلعوں سے ابھرتی ہوئی احیاء اسلام کی تحریکوں سے خوف زدہ ہو کر کی جارہی ہے اور ہمارے نادان حکمران بلاوجہ کٹھ پتلی کے روپ میں خود فروش، خدا فراموش اور اسلام دشمن بن کر ناچ رہے ہیں۔

میری عادت نہیں زخموں پہ نمک پاشی کی — کیا کروں داغ اگر یہ نہ دکھاؤں تجھ کو
میں نے یہ قصہ کہا اس لیے ہو کر مجبور — جو ترا فرض ہے وہ یاد دلاؤں تجھ کو

پس چہ باید کرد: سب سے اہم چیز یہ ہے کہ کسی حالت میں بھی اللہ سے مایوس نہ ہوا جائے اور جدوجہد سے کسی صورت

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

میں بھی پہلوتہی نہ کی جائے۔ مومن کی قوت کا سب سے بڑا ذریعہ اللہ رب العزت سے گہرا تعلق ہے اور اس کا وعدہ ہے کہ اہل ایمان اور اہل تقویٰ کا مستقبل ہر حال میں روشن ہے۔ دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی۔ اور اگر اہل ایمان صحیح طریقے سے جدوجہد کریں تو انہیں آخرت کی کامیابیوں کے ساتھ دنیا میں بھی کامرانی حاصل ہوگی۔ اس لیے حالات کیسے ہی مشکل اور نامساعد ہوں، اہل ایمان کے لیے مایوسی کی گنجائش نہیں۔ قرآن کے الفاظ میں مایوسی کفر ہے۔ ﴿انہ لاییأس من روح اللہ الا القوم الکافرون الرعد﴾ اور اللہ کی رحمت کا دروازہ ہر لمحے کھلا ہوا ہے ﴿لاتقنطوا من رحمة اللہ﴾ ہر حال میں مؤمن کی نظر اپنے اللہ کے وعدے، اس کی نصرت ومدد، اس کی اعانت وسرپرستی اور اس کی رضا وخوشنودی پر ہوتی ہے اور یہی وہ چیز ہے جو اس کی زندگی کے ہر لمحے کو روشن اور اس کے ہر قدم کو تابناک مستقبل کی طرف پیش رفت بنا دیتی ہے۔ یہ اللہ کا ہم پر بڑا انعام ہے، رحم ہے اور فضل ہے کہ اس نے ہماری کمزوریوں کی بنا پر ہم کو کسی ایسی آزمائش میں نہیں ڈالا جو ہماری استطاعت سے بڑھ کر ہو۔ انسان کی فطرت کا لحاظ کرتے ہوئے، اس نے یہ وعدہ کیا ہے کہ وہ ہمیں زمین میں خلافت اور تمکن عطا کرے گا تاکہ لیظہرہ علی الدینکلہ کہ اس دین کو دوسرے تمام طریقوں کے اوپر غالب کرنا اس کی سنت اور وعدہ ہے۔ یہ ساری چیزیں بھی مسلمان کا مقدر ہیں، ہماری تاریخ اور جدوجہد کا حصہ ہیں۔ مستقبل امت مسلمہ کا ہے، اکیسویں صدی اسلام کی صدی ہے۔ مستقبل کی تابناکی کے بارے میں ایک مؤمن کو ایک پل کے لیے بھی شک اور خوف میں مبتلا نہیں ہونا چاہیے۔ یقیناً مشکلات ہیں، مسائل ہیں، پریشانیاں ہیں، فکری چیلنجز اور تصادم ہے، مگر اس کے ساتھ ساتھ ایمان کی قوت، اللہ پر بھروسا اور اللہ کا یہ وعدہ کہ مایوس کبھی نہ ہونا، ہمت نہ ہارنا اور تابناک مستقبل کا خواب ہی نہیں دیکھتے رہنا، بلکہ اس کے لیے سرگرم عمل ہوجانا، یہ مسلمان کی شخصیت کا لازمی حصہ ہیں۔ تو کیسی ہی پریشانیاں اور کیسی ہی مشکلات کیوں نہ ہوں، لیکن ہماری نگاہ اسلام کے روشن مستقبل ہی پر ہونی چاہیے

﴿ولا تهنوا ولا تحزنوا وأنتم الأعلون إن كنتم مؤمنين﴾

کیا یہ حقیقت نہیں ہے کہ جب ہمارے نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے پانچ ساتھیوں کے ساتھ اس دعوت اور اس پیغام کا آغاز فرمایا تو حضرت ابوذر غفاریؓ اسلام قبول کرتے ہیں اور ان کو تشدد کا نشانہ بنایا جاتا ہے۔ یہ ابھی آغاز وحی کا تیسرا اور چوتھا سال ہی ہے۔ اس موقع پر ایک اعرابی آتا ہے، اسلام قبول کرتا ہے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم اس سے یہ کہتے ہیں کہ اپنی بستی میں چلے جاؤ اور انتظار کرو اس وقت کا جب یہ دین غالب ہوگا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم قریش کے سرداروں کو مخاطب فرما کر کہتے ہیں کہ میں تم کو ایک ایسا کلمہ نہ بتادوں کہ جس کو اگر تم مان لو تو پھر عرب اور عجم تمہارے تابع ہوں گے...... پھر وہ وقت کہ سید کائنات جب مکہ چھوڑ کر جا رہے ہیں۔ ہجرت کا وقت ہے، بظاہر کسمپرسی کا عالم ہے، اپنے وطن کو چھوڑنا پڑ رہا ہے اور اس وقت سراقہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا تعاقب کرکے آپ صلی اللہ علیہ وسلم تک پہنچ جاتا ہے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم اسے فرماتے ہیں کہ تمہیں کسریٰ (وقت کی سپر پاور) کے کنگن پہنائے جائیں گے۔ کیا سخت وقت ہے، کسریٰ کے کنگنوں کا ذکر کس اعتماد کے ساتھ کیا جارہا ہے اور پھر چشم فلک نے دیکھا کہ کسریٰ کے کنگن مال غنیمت میں

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

آئے اور اس شخص کو پہنائے بھی گئے۔ سبحان اللہ!

تابناک مستقبل کی بات میں کسی خوش فہمی یا شاعرانہ خیال آرائی کی بنا پر نہیں کر رہا، بلکہ اللہ کی کتاب اور نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت یہ دونوں ہمیں یہ اعتماد اور یقین دلاتے ہیں کہ جو بھی حالات ہوں اور جیسے بھی حالات ہوں، وہ لوگ جنھیں اللہ نے ایمان کی دولت سے مالا مال کیا ہے وہ تابناک مستقبل کے بارے میں کسی غلط فہمی یا مایوسی کا شکار نہیں ہوسکتے۔ (وکان حقا علینا نصر المؤمنین۔ الروم) (حقا علینا ننج المؤمنین۔ یونس)

تاریخ کی گواہی: اگر آپ تاریخ پر نگاہ ڈالیں تو آپ دیکھیں گے کہ تاریخ کے نشیب و فراز، قوموں کا عروج و زوال، پستی و بلندی کے مناظر، کامیابی و ناکامی کی داستانیں، فتح و شکست کا نہ ختم ہونے والا سلسلہ، اللہ کے اسی وعدے کا منظر نامہ پیش کرتے ہیں۔ معلوم تاریخ میں کم از کم ۳۶ عظیم تہذیبوں کے اسی سفر کی کہانی ملتی ہے اور عروج کے وقت ہر تہذیب کو یہی گمان تھا کہ اب اس کا کوئی مقابلہ کرنے والا نہیں ہے۔ لیکن پھر چشم فلک نے دیکھا کہ اُسے زوال، انتشار اور شکست کا سامنا کرنا پڑا۔ دوسری اقوام ابھریں اور ''وتلك الايام ندا ولهابين الناس'' کا یہ ابدی اصول برابر چلتا رہا اور چلتا رہے گا۔ حضرت عیسٰی علیہ السلام نے سچ کہا تھا کہ: کتنے آگے ہیں جو پیچھے رہ جائیں گے اور کتنے پیچھے ہیں جو آگے نکل جائیں گے۔ پوری تاریخ کو چھوڑیئے۔ بہت سے لوگ آج موجود ہیں، جنھوں نے چشم سر سے دیکھا کہ سلطنت برطانیہ کا ایک زمانے میں کیا دبدبہ تھا۔ اسے دنیا کی حکمران قوت ہونے کا زعم تھا۔ غلبہ و بالادستی کو وہ اپنا مقدر سمجھتی تھی اور غرور کا یہ حال تھا کہ اس نے انگریزی زبان میں اس محاورے کا اضافہ کیا کہ: Sun is never set in the British Empire

چونکہ دنیا کی چوتھائی سرزمین پر اس کی حکمرانی تھی، اس لیے اس کا دعویٰ تھا کہ ہماری حکمرانی میں کبھی سورج غروب نہیں ہوتا۔ ایک جگہ سے غروب ہوتا ہے تو دوسری جگہ سے ابھر آتا ہے۔ لیکن پھر ہم نے دیکھا کہ چند ہی سالوں میں اس کی سلطنت قصۂ پارینہ بن گئی اور کیفیت یہ ہوئی کہ وہ ایک سپر پاور سے سکڑ کر صرف ڈیڑھ جزیرے کی حکومت رہ گئی اور اب تو یہ عالم ہے کہ ہفتوں اس کی قلمروں میں سورج طلوع نہیں ہوتا! اسی طرح دولت برطانیہ نے انگریزی زبان میں اس محاورے کا اضافہ کیا کہ: British rules the waves یعنی دنیا کے سارے سمندروں کے پانی پر ہماری حکمرانی ہے۔ لیکن پھر ہم نے دیکھا کہ: British had to waves the rule یعنی برطانیہ کو حکومت چھوڑنا پڑی اور سمندر اس کی گرفت سے نکل گیا۔ یہ ہیں وہ نشیب و فراز جن میں مغرور کے طلسم کا ٹوٹنا اور مظلوم کا بالاتر قوت بن جانا، یہ سب مناظر دیکھے جاسکتے ہیں۔

ابھی کل کی بات ہے کہ امریکہ اور اشتراکی روس دونوں بڑی طاقتیں (Super Power) تھیں اور دونوں ایک دوسرے سے برابر پنجہ آزمائی کر رہی تھیں۔ کیا آپ بھول گئے کہ روس کے سربراہ مملکت خروشچیف، اقوام متحدہ کے ہال

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

میں میز پر اپنے جوتے رکھ کر کہتا ہے کہ :I have come to bury captalism (میں یہاں سرمایہ داری کا جنازہ نکالنے آیا ہوں)۔ اور پھر آپ نے دیکھا کہ کس طرح روس منتشر ہو جاتا ہے گویا کہ ایک خاص موقع پر کسی کا حاوی ہونا کوئی ایسی چیز نہیں ہے کہ جس کو ابدی (everlasting) سمجھا جائے، اقتدار، غلبہ اور قوت سب بڑی وقتی اور عارضی چیزیں ہیں۔ ہم نے خود اس کا نظارہ کیا ہے اور مجھے یقین ہے کہ ایسے ابھی اور بہت سے تجربات اور مناظر ہم دیکھیں گے۔ اس لیے یہ سمجھ لینا کہ اس وقت فلاں غالب ہے تو وہی غالب رہے گا، درست نہیں۔

اپنے ملک کی تاریخ بھی دیکھ لیجیے۔ کیا یہ ایک حقیقت نہیں کہ ایک سر پھرے آمر (اسکندر مرزا) نے مکمل اقتدار کے زعم میں برسر اقتدار آنے کے بعد پہلا بیان یہ دیا تھا کہ ہم ان مولویوں کو کشتیوں میں بٹھا کر سمندر پار بھیج دیں گے۔ لیکن اللہ کی قدرت کو آپ نے دیکھا کہ مولوی تو الحمدللہ وہیں ہیں۔ خود اس کو ایک مہینے کے اندر ملک چھوڑنا پڑا۔ یہاں کون تھا جس نے یہ دعویٰ نہیں کیا کہ ''ہماری کرسی مضبوط ہے اور اس کو کوئی نہیں ہلا سکتا'' لیکن کون سی کرسی ہے جو باقی رہ گئی۔ آپ چاہیں وسیع تر تاریخ کے پس منظر میں دیکھیں، خواہ اپنے دور کے عالمی سطح پر رونما ہونے والے نشیب وفراز کو دیکھیں اور خواہ اپنے ملک میں رونما ہونے والی تبدیلیوں پر غور کریں، کہیں بھی مایوسی کے لیے وجہ جواز نظر نہیں آتی۔ اس سے انکار نہیں کہ تاریکی آتی ہے، شکستیں بھی ہوتی ہیں، لیکن ہر نشیب کے بعد فراز اور ہر شکست کے بعد کامیابی کا امکان بھی رونما ہوتا ہے (انّ مع العسر یسرا ان مع العسر یسرا) کیا خود نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے بدر کی بلندیوں کے بعد احد کی ہزیمت نہیں دیکھی؟ کیا حدیبیہ کے بعد فتح مکہ کا منظر رونما نہیں ہوا؟ کیا فتح مکہ کے بعد حنین سے سابقہ پیش نہیں آیا؟ یہ نشیب وفراز، زندگی کی حقیقت ہیں۔ لیکن ان میں سے کسی کو لے کر یہ سمجھنا کہ اب کچھ ممکن نہیں اور ہمت ہار جانا اور مایوسی میں گرفتار ہو جانا کسی مسلمان کا شیوہ نہیں۔ جس کی نگاہ تاریخ پر ہو، انسانی زندگی کے نشیب وفراز پر ہو، وہ کبھی بھی اس غلط فہمی میں مبتلا نہیں ہو سکتا۔ اس کے اوپر قرآن شاہد ہے، سیرت شاہد ہے، پوری تاریخ گواہ ہے اور میرا اور آپ کا تجربہ گواہ ہے۔ تو پھر کیوں ایک خاص وقت کی کیفیت کو ہم مستقبل اور دوام کا درجہ دینے کی غلطی کریں۔ ہمیں چیزوں کو ان کے حقیقی پس منظر میں دیکھنا چاہیے اور اسی کی روشنی میں پھر ہمیں اپنا رویہ اور اپنا کرنے کا کام متعین کرنا چاہیے:

تندیٔ بادِ مخالف سے نہ گھبرا اے عقاب یہ تو چلتی ہے تجھے اونچا اڑانے کے لیے

مزاحمت ـــــ اصل طاقت: استعمار کی منصوبہ بندی ہمیشہ سے یہی رہی ہے جس کی تلقین بش معلون اور ان کی ٹیم کر رہی ہے کہ تعلیم کو تبدیل کرو، مدرسوں کو سیکولر رنگ میں رنگو۔ جہاد کا لفظ تو آج نہیں، پہلے دن سے دشمنوں کا ہدف رہا ہے۔ آپ کو معلوم ہے کہ اسلام پر غالباً دوسری صدی ہجری کے اندر پہلی تنقیدی کتاب جو ایک عیسائی عالم کی طرف سے آئی ہے، اُس میں اصل ہدف جہاد اور نبی اک صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی ہے۔ یعنی نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات مبارک اور جہاد کا تصور ہمیشہ سے اصل ہدف رہے ہیں۔ فرانسیسی، برطانوی، استعماری دور کا مطالعہ کیجیے، سب کے سامنے اصل ہدف جہاد تھا۔ خواہ وہ السنوسی کی تحریک ہو، خواہ وہ الجیریا کے عبدالقادر کی تحریک ہو، خواہ وہ صومالیہ کی تحریک ہو، خواہ براعظم کے شاہ

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اسماعیل شہید کی تحریک ہو، ہر جگہ آپ دیکھیں گے کہ جہاد ہی نے استعمار کا راستہ روکا ہے اور جہاد ہی کو استعمار نے ہدف بنایا ہے۔ یہ نئی نہیں پرانی حکمت عملی اور بظاہر معلوم ہوتا ہے پتا نہیں یہ کیا کرلیں گے لیکن جہاد کا تصور ہو یا نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کی سنت کی مرکزی حیثیت دشمن کی ساری یلغار کے باوجود ان پر کوئی دھبہ نہیں آسکا اور نہیں آسکتا۔ جھوٹی نبوتیں تک برپا کی گئیں لیکن دین حق پر کوئی آنچ نہ آئی۔ اسلام کو دبانے کی جتنی کوششیں ہوئیں وہ اتنا ہی مستحکم ہوا:

اسلام کی فطرت میں قدرت نے لچک دی ہے
اتنا ہی یہ ابھرے گا جتنا کہ دبا دیں گے

تاریخ میں ہم پر بڑے سخت دور گذرے ہیں۔ شاید سب سے سخت دور، وہ تھا جب چنگیز اور ہلاکو کی فوجوں نے بغداد کی اینٹ سے اینٹ بجادی تھی...... لیکن اس کے بعد دیکھیے کہ دو سو سال کے اندر اندر پھر حالات بدل گئے اور انھی تاتاریوں کے دل و دماغ کو اسلام نے مسخر کرلیا، جنھوں نے مسلمانوں کو فتح کیا تھا۔ اسلام نے ان کو فتح کرلیا اور بقول اقبال:

ہے عیاں یورش تاتار کے افسانے سے
پاسباں مل گئے کعبے کو صنم خانے سے

وہی تاتار جو مسلمانوں پر ظلم و ستم کے پہاڑ ڈھا رہے تھے اور شہداء کے سروں سے مینار بناتے تھے، انھی کے ذریعے سے پھر ۴۰۰ سال تک مسلمانوں کی حکمرانی کا نظارہ چشم تاریخ نے دیکھا۔ لہٰذا تاریخ کے نشیب و فراز سے پریشان نہ ہوں بلکہ ان چیلنجز کے مقابلہ کے لیے سینہ سپر ہو جائیں۔ جہاں نام ہی مزاحمت کا ہے، جہاد نام ہے کفر اور ظلم کے غلبے کے خلاف جدوجہد کرنے کا۔ خواہ قلم سے ہو، زبان سے ہو، ذہن سے ہو، مال سے ہو یا جان سے ہو۔ یہ سب اس کی شکلیں ہیں اور اس وقت دشمنوں کا یہی ہدف ہے کہ مسلمانوں میں روح جہاد باقی نہ رہے۔ دینی مدارس کو سب سے بڑا فکری چیلنج جو دور جدید میں درپیش ہے یہی ہے اور اسی کی پاسبانی انھوں نے کرنا ہے، حالات کے آگے سپر نہ ڈالنے کا داعیہ پیدا کرنا ہے اور مقابلے کا جذبہ اور اُمنگ فروغ دینا ہے۔ اقبال نے ''ابلیس کی مجلس شوریٰ'' میں ابلیس کی اس پریشانی کا اظہار بڑے واضح الفاظ میں کر دیا ہے:

ہے اگر مجھ کو خطر کوئی تو اس امت سے ہے
جس کے خاکستر میں ہے اب تک شرار آرزو

اس لیے اگر آپ مجھ سے ایک لفظ میں پوچھنا چاہتے ہیں کہ دور حاضر کے اس فکری چیلنج کا مقابلہ دینی مدارس کیسے کرسکتے ہیں اور تابناک مستقبل کی ضمانت کیا ہے؟ تو وہ ہے آرزو، وہ ایمان ہے، وہ جذبۂ مزاحمت ہے، وہ یہ احساس ہے کہ ہمیں اللہ اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے بتائے ہوئے طریقے کو قبول کرنا ہے۔ اس کے داعی بننے کے لیے جدوجہد کرنی ہے، اسی سے دنیا اور آخرت میں ہمارا مستقبل روشن ہوسکتا ہے:

یوں اہل توکل کی بسر ہوتی ہے
ہر لحظہ بلندی پہ نظر ہوتی ہے
گھبرائیں نہ ظلمت سے گذرنے والے
آغوش میں ہر شب کے سحر ہوتی ہے

وما علینا الا البلاغ

© rasailojaraid.com